(غلام گردش)

تنولی، کبھی لاہور نہیں آئیگا!

تربیلا ڈیم کے ریسٹ ہاؤس میں کوئی خاص بات نہیں۔ سرکاری طرز کی عام سی عارضی قیام گاہ۔ سادہ سا فرنیچر اور انتہائی سادہ سا انتظام زندگی۔ سرکار کے تمام ریسٹ ہاؤس یا قیام گاہیں تقریباً ایک جیسی ہیں۔ تین مہینے پہلے تقریباً شام کو اس جگہ پہنچا تو سورج ڈھل چکا تھا۔ اس قدرتی طلسم کا قطعاً اندازہ نہیں تھا جو دن کی روشنی میں رواں ہو جاتا ہے۔ تربیلا جھیل، رنگ و نور کی ایک بارش سی بن جاتی ہے جو دل پر پھوار بنکر برستی ہے۔

خیر شام کو کمرے میں اشفاق احمد کی کتاب پڑھ رہا تھا کہ چوکیدار نے آکر بتایا کہ کوئی نوجوان طالبعلم ملنا چاہتا ہے۔ تربیلا میں کسی کو بھی نہیں جانتا تھا۔ حیرت ہوئی کہ اس انجان جگہ پر کون ملنے آیا ہے۔ حیرت دور کرنے کیلئے ڈرائنگ روم میں پہنچا تو ایک اجنبی سا نوجوان صوفے پر بیٹھا تھا۔ درمیانے قد کا ایک ایسا طالبعلم جسکی آنکھوں کے سامنے موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگی ہوئی تھی۔ منہنی سی جسامت کے نوجوان کے چہرے پر سادگی اور شرافت کی بھرپور چھاپ لگی ہوئی تھی۔ مکالمہ شروع ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ بتایا کہ انگریزی میں ماسٹرز کیا ہوا ہے۔ اسکے بعد ایم۔فل بھی کر رکھا ہے۔ اسکی باتوں میں منفرد طرح کی شائستگی تھی۔ بتانے لگا کہ تربیلا کے نزدیک کسی تعلیمی ادارے میں کبھی کبھی لیکچر دینے جاتا ہے۔ مگر عملی طور پر بے روزگار ہے۔ عجیب سی تکلیف ہوئی کہ ایک پڑھا لکھا نوجوان بیروزگاری کی آگ میں جھلس رہا ہے اور پریشان حال ہے۔ اس نے محکمہ تعلیم میں درجنوں جگہ نوکری کیلئے درخواستیں بھجوائی مگر کسی جگہ شنوائی نہ ہو پائی۔ میرے پاس بھی وہ اسی لیے آیا تھا کہ کسی بھی جگہ پڑھانے کی نوکری دلوادوں۔ خیر دس پندرہ منٹ کے مختصر ملاقات کے بعد واپس چلا گیا۔ لاہور پہنچ کر دو تین تعلیمی اداروں میں اسکی تعیناتی کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہا۔ اس لڑکے کا نام زوہیب تنولی تھا مگر میرے ذہن سے اسکے نام کا پہلا حصہ نکل گیا اور صرف تنولی ہی رہ گیا۔ کبھی کبھی مجھے تربیلا سے میسج کرتا تھا۔ موبائل فون پر یہ میسج اس درجہ دقیق انگریزی میں ہوتا تھا کہ ڈکشنری نکال کر چند الفاظ کے مطلب تلاش کرنے پڑتے تھے۔ میسج سے کئی نئے الفاظ سیکھنے کا موقعہ ملا۔ قصہ کوتاہ یہ کہ میں اسے بے روزگاری کے جہنم سے باہر نہ نکال سکا۔ انہی دنوں میں تبادلہ لاہور ہی میں ایک کارپوریشن میں ہو گیا۔ تنولی ذہن سے بالکل نکل گیا۔ سرکاری نوکری بھی عجیب سی جادونگری ہے۔ ہر پوسٹنگ پر ایک جہان ختم ہو جاتا ہے اور ایک نیا جہان اپنے مصائب سمیت سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ نئی تعیناتی میں پرانے ادارے کے مسائل اور اکثر لوگ بھول سے گئے۔ ان میں تنولی بھی تھا۔

چار دن پہلے دفتر میں بیٹھا تھا کہ تنولی ملنے آ گیا۔ عجیب اَمر یہ بھی تھا کہ اس نے لاہور آنے کے متعلق بالکل نہیں بتایا تھا۔ خاموشی سے کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ چہرے پر یاس اور غم کی نمایاں پرچھائی نظر آئی۔ مکمل خاموش تھا۔ کسی مجسمے یا بُت کی طرح مستقل زبان بندی کا نمونہ۔ حال احوال کرنے لگا تو محسوس ہوا کہ اسکی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ آنسو باقاعدہ چہرے پر پانی کی دھار بنکر نیچے گر رہے تھے۔ عجیب سا لگا کہ ایک پڑھا لکھا نوجوان اتنی تکلیف میں ہے کہ اپنے آنسو تک نہیں روک پا رہا۔ پوچھنے پر، تنولی نے رونا شروع کر دیا۔ دفتر کا ماحول عجیب سا ہو گیا۔ میرے ساتھ دو افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی پریشان سے ہو گئے۔ اصرار پر تنولی نے جو کچھ بتایا،

آپکے سامنے اسکے الفاظ میں سامنے رکھ رہا ہوں۔

کہنے لگا مجھے لاہور میں ایک سرکاری دفتر میں نوکری کی درخواست جمع کروانی تھی۔شام کو گھر سے نکلا تو والدہ نے قران کے سائے میں رخصت کیا۔حفاظت کیلئے چار قُل پڑھ کر کئی بار پھونکے۔بس نے رات تین بجے کے قریب لاہور کے لاری اَڈے پہنچا دیا۔خاموشی سے اَڈے میں ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔کئی رکشہ ڈرائیور بار بار نزدیک آ کر پوچھنے لگے کہ باؤ جی، کدھر جانا ہے۔سواری حاضر ہے۔سب کو انکار کرتا رہا۔مگر انہیں اندازہ ہو گیا کہ اس نوجوان کو لاہور شہر کا کچھ بھی معلوم نہیں۔کچھ دیر بعد، ایک رکشہ والا آیا اور کہنے لگا کہ ایک ہوٹل میں لے جاتا ہوں۔وہاں ناشتہ کر لیں۔پھر سرکاری دفتر چھوڑ آؤنگا۔اس میں سوار ہو گیا۔تھوڑی دیر بعد محسوس ہوا کہ رکشہ تنگ گلیوں میں جا رہا ہے۔پوچھنے پر ڈرائیور کہنے لگا کہ ہوٹل بس نزدیک ہی ہے۔ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ہر طرف اندھیرہ ہی اندھیرہ تھا۔ایک دم رکشہ کو چند باوردی افراد نے روک لیا۔پتہ نہیں تھا کہ پنجاب پولیس کی یونیفارم تبدیل ہو چکی ہے۔سمجھا کہ رینجرز والے ہیں۔خیر پولیس والوں نے رکشہ سے اتار کر انتہائی بدتمیزی سے پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آ رہے ہو۔ابھی سوال ہو ہی رہے تھے کہ ایک پولیس والے نے تلاشی لینی شروع کر دی۔والدہ نے چند ہزار روپے جیب میں ڈال دیے تھے۔سپاہی نے بڑے اطمینان سے پیسے جیب سے نکال کر کہا کہ اب جاؤ، جہاں بھی جانا ہے، دفع ہو جاؤ۔میں وہیں رُک گیا۔پولیس والوں کو کہا کہ میرے پاس صرف یہی پیسے ہیں۔میں اب کہیں نہیں جا سکتا۔پولیس والا بولا، کہ یہ تو کوئی عادی مجرم ہے۔اسے تھانے لے چلو۔میں زمین پر بیٹھ گیا اور کہا کہ تم مجھے گولی مار دو یا تھانے لے جاؤ، میرے پیسے واپس کرو۔میں پڑھا لکھا آدمی ہوں۔آپ لوگ زیادتی کر رہے ہیں۔پولیس والے وہاں سے ایک دم غائب ہو گئے۔دوسری جیب میں چند سو روپے رہ گئے تھے جو چھپا کر رکھے ہوئے تھے۔رکشہ والا پولیس والوں سے ملا ہوا تھا اور منصوبہ بندی کے تحت مجھے وہاں لیکر آیا تھا۔خیر میں نے رکشہ والے کی منت کی کہ جس سرکاری دفتر میں درخواست دینی ہے، وہاں لے جاؤ۔صبح ہو رہی تھی۔رکشہ والا مال روڈ پر آیا اور ایک اجنبی سی جگہ پر چھوڑ گیا۔نزدیک ایک مسجد تھی۔وہاں چلا گیا۔نماز کا وقت نہیں ہوا تھا مگر مسجد کے اندر بیٹھ گیا۔نماز کے بعد دعا ہوئی تو آنسو نکل آئے، کہ اے خدا، میں نے تو کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی، پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔آنسو دیکھ کر ایک ادھیڑ عمر بزرگ نزدیک آیا اور پوچھنے لگا کہ کیوں رو رہے ہیں۔کیا جواب دیتا۔مگر بار بار پوچھنے پر بتایا کہ ایک رکشہ والے اور چند پولیس والوں نے ملکر لوٹ لیا ہے اور میں اس شہر میں مسافر ہوں۔اجنبی نمازی مجھے لیکر اپنے گھر آ گیا۔مسجد کے نزدیک گھر میں صرف دو کمرے تھے۔جیسے ہی مہربان شخص کمرے میں بٹھا کر دوسرے کمرے میں گیا، تو بیوی نے اونچی آواز میں لڑنا شروع کر دیا۔کانوں میں صرف ایک فقرہ گونجا کہ آپ کس کو پکڑ کر گھر لے آئے ہیں۔آج کل دہشت گردی عروج پر ہے۔یہ لڑکا تو ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔الفاظ سن کر گھر سے باہر نکلا اور محلّہ کی نکڑ پر کھڑا ہو گیا تا کہ آٹھ بج جائیں اور دفتر جا سکوں۔ڈیڑھ گھنٹہ مسلسل کھڑا رہا۔اتنی دیر میں وہی مہربان انسان اور اسکی بیوی موٹر سائیکل پر نزدیک آئے۔اہلیہ نے غور سے مجھے دیکھا اور خاوند سے کہنے لگی کہ یہ نوجوان تو شکل سے دہشت گرد نہیں لگتا۔مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔اپنے بیٹے کو بلوایا اور کہا کہ فوری طور پر مجھے گھر لے جائے۔ناشتہ دے اور کپڑے استری کروائے۔گھر پہنچ کر ناشتہ کروایا گیا اور کپڑے بھی استری کروا کر دیے گئے۔ایک اجنبی گھرانے سے مجھے اتنی محبت کی توقع نہیں

تھی۔خیر شکر یہ ادا کر کے باہر نکلا۔لوگوں سے سرکاری دفتر کا پتہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو مال روڈ پر ہی ہے۔وہاں پہنچا تو دفتر میں کوئی بھی نہیں تھا۔نو بجے کے قریب عملہ آیا۔اپنی درخواست جمع کروائی۔وہاں سے سیدھا آپکے دفتر آ گیا ہوں۔پورا واقعہ سناتے ہوئے تنولی کی آنکھوں سے کئی بار آنسو گرے۔بذات خود، میں عجیب سے دکھ کا شکار ہو گیا۔دفتر میں بیٹھے ہوئے ایک افسر نے مشورہ دیا کہ تنولی کو چاہیے کہ ایف آئی آر کٹوائے اور پولیس کے اہلکاروں کی زیادتی کے متعلق باقاعدہ شکایت کرے۔مگر دوسرے افسر نے کہا کہ کوئی فائدہ نہیں۔کچھ نہیں ہوگا۔بلکہ جو کچھ بچ گیا ہے، وہ بھی ضائع ہو جائیگا یا گنوانا پڑیگا۔نوجوان نے خود ہی کہا کہ وہ کچھ نہیں کرنا چاہتا۔اسے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔اپنا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہے۔وثوق سے عرض نہیں کر سکتا کہ اس نوجوان نے ٹھیک کیا یا غلط۔مگر یہ نوجوان ہمارے ریاستی اداروں کیلئے بذات خود ایک سوالیہ نشان سا بن چکا ہے۔

کچھ اور تو نہ کر سکا۔ذہن میں صرف یہ خیال آیا کہ تنولی کو لاہور کے راستوں کا بالکل نہیں پتہ۔کہیں یہ دوبارہ کسی حادثہ کا شکار نہ ہو جائے۔ڈرائیور کو کہا کہ اسے لاری اڈے لے کر جائے۔تربیلا کی بس میں سوار کروائے اور جب تک بس روانہ نہ ہو جائے، وہیں کھڑا رہے۔بس کا نمبر بھی نوٹ کرے۔خیر تنولی کو ذمہ داری سے اسکے گھر روانہ کیا۔میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا۔راستے میں فون کر کے خیریت بھی معلوم کرتا رہا۔آپ اس نوجوان کا نام تھوڑی دیر کیلئے بھول جایئے۔اسے کوئی بھی نام دے دیجئے۔بیروزگاری کا تندور اپنی پوری آگ سے ہماری نوجوان نسل کو زندہ جلا رہا ہے۔آپ جتنا مرضی پڑھ لیں۔جو مرضی کر لیں۔باعزت نوکری ملنا تقریباً ناممکن ہو چکی ہے۔اس وقت ہزاروں نہیں، لاکھوں بھی نہیں، کروڑوں نوجوان بچے اور بچیاں بے روزگار ہیں۔اپنے گھر والوں سے بھی شرمندہ سے رہتے ہیں جو اپنی ساری جمع پونجی انکی تعلیم پر لگا بیٹھے ہیں۔انکے والدین کی آنکھوں میں اولاد کے سکھ کے خواب ہیں۔مگر یہ خواب صرف اور صرف خواب ہی رہتے ہیں۔ان نوجوان بچیوں اور بچوں کے مسائل حل کرنے کیلئے کوئی بھی سنجیدہ نہیں۔سکہ کا دوسرا رخ ہمارے ریاستی اداروں کا وہ مشکل رویہ ہے جہاں ہر اہلکار حسب توفیق عام اور کمزور لوگوں سے خراج وصول کر رہا ہے۔جیبوں کی تلاشی لیتے لیتے انکے تمام پیسے لوٹ لیتا ہے۔یہاں کس سے گلہ کریں اور کس سے شکایت کریں۔لوٹ مار، سودے بازی اور ڈاکہ زنی کا ہمہ وقت ناجائز دھندا، اب گھور کھ دھندا بن چکا ہے۔نوجوان نسل حق بجانب ہے کہ پوچھے کہ ہمارے ساتھ یہ زیادتی کیوں ہو رہی ہے۔اسے کوئی روک کیوں نہیں رہا۔لگتا ہے یہاں ہر نوجوان لڑکا اور لڑکی زوہیب تنولی کی طرح غم زدہ اور دکھی ہے۔ہاں ایک اور بات، تنولی اُٹھتے ہوئے کہنے لگا، کہ زندگی میں پہلی بار لاہور آیا تھا۔اب وہ کبھی لاہور نہیں آئیگا!

راؤ منظر حیات